تعیین اجرت کا معیار: شرعی جائزہ

Standard for Determining Wages: A Shariah Perspective

Israr ullah Mashwani
PhD Scholar, department of Islamic Thought History and culture, AIOU, Islamabad
Email: israrullahmashwani@gmail.com
Prof. Dr. Mohyuddin Hashmi
Chairman, Department of Islamic Thought History and Culture, AIOU, Islamabad
Email: mohyuddin.hashmi@aiou.edu.pk

Abstract:
Allah Almighty has appointed four types of means of livelihood for humans. Trade, agriculture, industry and employment. But observation it is that most of these four people are related to the Job. Therefore, many our country is related to the job sector. Among the problems that the world is facing in the present time, one of the major problems is the anxiety of the employees and their balanced wages. On the presentation of the annual budget in our country, government employees hold protests to increase their salaries. Likewise, the employees of private institutions also continue to struggle so that their salaries can be increased, and they can meet their living needs. In other provinces in relation to KPK, teachers at religious schools, other employees and imams of mosques are also victims of this problem. Their salaries are up to eight thousand, ten thousand and more than fifteen thousand despite this storm of inflation. Although they do not protest, they are very low. They are satisfied with the salary, but they are being exploited economically. Although they do not complain to the trustees, they also wish that their wages should be fixed so that they can live like other middle-class people of the country can meet the needs of life. But the question arises, According to Sharia, the wages of employees should be determined under what criteria? Due to which this class can be satisfied economically and can meet their needs of life in a good way. The article under review is related to "Sharia standard of wage determination".
Keywords: Religious schools, Trustee, Religious teachers, Imams, Employees, Quran, Sunnah, Fiqh

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے چار قسم کے ذرائعِ معاش مقرر کئے ہیں، تجارت، زراعت، صناعت اور ملازمت۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ ان چاروں میں سے لوگوں کا زیادہ واسطہ ملازمت سے پڑتا ہے۔ چناں چہ ہمارے ملک کی ایک کثیر تعداد شعبۂ ملازمت سے وابستہ ہے۔ عصرِ حاضر میں دنیا جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ ملازمین کی بے چینی اور ان کی متوازن اجرت بھی ہے۔ ہمارے ملک میں سالانہ بجٹ کے پیش ہونے کے موقع پر سرکاری ملازمین تنخواہیں بڑھانے کے لئے احتجاجی مظاہرے کرتے ہیں۔ اسی طرح پرائیویٹ اداروں کے ملازمین بھی تگ و دو کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی تنخواہ بڑھ جائے اور وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پوری کرسکیں۔ دیگر صوبوں کی بنسبت kpk کے دینی مدارس کے مدرسین، دیگر ملازمین اور مساجد کے ائمہ حضرات بھی اس مسئلہ کا شکار ہیں۔ ان کی تنخواہیں مہنگائی کے اس طوفان کے باوجود آٹھ ہزار، دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار تک ہیں۔ وہ اگرچہ احتجاجی مظاہرے نہیں کرتے، انتہائی کم تنخواہ پر قناعت اختیار کرتے ہیں، لیکن معاشی طور پر ان کا استحصال کیا جارہا ہے۔ وہ اگرچہ متولیین سے شکوہ نہیں کرتے لیکن ان کی بھی یہ آرزو ہوتی ہے کہ ان کی اتنی اجرت مقرر ہونی چاہئے جس سے وہ ملک کے دیگر متوسط افراد کی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی کو پوری کرسکیں۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ شرعی رو سے ملازمین کی اجرت کو کس معیار کے تحت مقرر کیا جائے؟ جس کی وجہ سے یہ طبقہ معاشی طور پر مطمئن ہوسکے اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو احسن طریقے سے پوری کرسکے۔

اسلام چوں کہ ایک جامع نظامِ حیات ہے، اس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے لئے واضح اور مبنی بر انصاف ہدایات اور احکامات موجود ہیں۔ اسلام نے ملازمین کے دیگر حقوق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے "حقِ اجرت" کے تعیین کا معیار بھی بیان کیا ہے۔ زیرِ نظر مضمون کا تعلق "تعیین اجرت کا شرعی معیار" ہے۔ اس مضمون میں اجرت کے تعیین کے معیار کا شرعی رو سے جائزہ لیا جائے گا۔ اس میں تین مباحث بیان ہوں گے۔ اجرت کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اجرت کے تعیین کے بنیادی شرائط اور اصول اور تعیینِ اجرت کا شرعی معیار۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

اجرت کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

لغوی اعتبار سے لفظ "اَجر" اور "اُجرت" کا ایک ہی معنی ہے، اس کی جمع "اُجُور" آتی ہے۔ اور یہ کئی معانی میں مستعمل ہے۔ اجر بمعنی عمل کا بدلہ۔[1] اسی طرح "مہر"، جیسا کہ باری تعالیٰ کے اس قول میں ہے:

" يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ "[2]

ترجمہ: اے نبی ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال کردی جن کے مہر آپ ادا کرچکے ہیں۔

اسی طرح اجر "ذکر حسن اور عمل صالح"[3] کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ باری تعالیٰ کے قول میں ہے:
" وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا "[4] کہ ہم نے اس کو اس کا بدلہ دنیا میں دیا۔

اجر اور اجرت الفاظ مترادفہ ہیں، اس وجہ سے اس کا ایک دوسرے پر اطلاق بھی ہوتا رہتا ہے۔ البتہ لفظ اجر "اجرت" سے عام ہے، کیوں کہ اجرت دنیوی بدلہ کو کہتے ہیں، جب کہ اجر دنیوی اور اخروی دونوں بدلوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[5]

اجر اور اجرت کی اصطلاحی تعریف میں بھی لغوی معنی کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور اس کا اطلاق عوض، بدل عن العمل اور بدلِ منفعت وغیرہ پر کیا گیا ہے۔ چناں چہ علاء الدین حصکفیؒ (م:1088ھ) فرماتے ہیں کہ اجرت منفعت حاصل کرنے کے ثمن کو کہتے ہیں۔[6] ابو البقاءؒ (م:1094ھ) فرماتے ہیں:

"الأجر والأجرة يقال فيما كان عقدا وما يجري مجرى العقد، ولا يقال إلا في النفع"[7] کہ اجر اور اجرت اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو عقد ہو اور عقد کے قائم مقام ہو، اور یہ صرف نفع میں استعمال کیا جاتا ہے۔
خلاصہ یہ کہ اجرت عمل یا منفعت کے عوض کو کہتے ہیں۔

تعیینِ اجرت کے بنیادی شرائط اور اصول:

فقہائے کرام نے تعیین اجرت کے سلسلہ میں بنیادی طور پر تین شرائط کا ذکر کیا ہے،[8] جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی شرط:

اجرت مالِ متقوم ہو، جیسے دراہم اور دنانیر (کرنسی) وغیرہ۔ اور اس کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز بیع میں ثمن واقع ہو سکتی ہے وہ اجارہ میں اجرت واقع ہو سکتی ہے، اور جو چیز ثمن واقع نہیں ہو سکتی وہ اجرت بھی واقع نہیں ہو سکتی۔[9]

دوسری شرط:

اجرت معلوم ہو۔ تاکہ بعد میں نزاع کا باعث نہ بنے۔ ان دونوں شرطوں پر تمام فقہائے کرام متفق ہیں۔ اور اس کے لئے اصل نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے: "من استأجر أجيرا فليعلمه أجره"۔[10] کہ جو شخص ملازم رکھے تو اسے اس کی اجرت سے خبردار کرے۔ چناں چہ اجرت یا تو اشارہ کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے یا معیّن کر کے اور یا بیان کرنے کے ساتھ۔

تیسری شرط:

اجرت ایسی منفعت نہ ہو جو معقود علیہ کے جنس سے ہو۔ جیسے ایک شخص کسی کو اپنا گھر اجارہ پر دے اور اس کی اجرت یہ مقرر کرے کہ وہ بھی اپنا گھر اسے رہائش کے لئے دے، یا خدمت کی اجرت خدمت مقرر کرنا، سواری کی

اجرت سواری مقرر کرناوغیرہ۔چوں کہ یہاں پر اجرت معقود علیہ کے جنس سے ہے، لہٰذا اس طرح کی اجرت مقرر کرنا ناجائز ہے۔وجہ یہ ہے کہ منفعت تھوڑا تھوڑا حاصل کیاجاتاہے اور عقد کے دوران منفعت معدوم ہوتی ہے ، لہٰذا عاقدین میں سے کسی ایک کا منفعت پر قبضہ مؤخر ہو گا، حالاں کہ جنس ایک ہونے کی صورت میں عاقدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی مجلس میں بدل اور عوض پر قبضہ کرے ، جو یہاں نہیں پایا گیا۔اس وجہ سے اس طرح کی صورت حال میں ربوٰ النّساء لازم آتاہے جو ناجائز ہے۔[11] ہاں البتہ اگر اجرت خلافِ جنس مقرر ہو، جیسے گھر کی رہائش کے بدلے خدمت وغیرہ تو یہ صورت درست ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ اجرت مقرر کرتے وقت تین شرائط کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ایک یہ کہ اجرت مالِ متقوم ہو، دوسری یہ کہ معلوم ہو، تیسری یہ کہ اجرت کسی ایسی منفعت کو مقرر نہ کیاجائے جو معقود علیہ کے جنس سے ہو۔ درج بالا شرائط کے ساتھ ساتھ معاصر فقہاء اور مفکرین نے اُجرتوں کے تعیین کے سلسلے میں چند اصول بھی بیان فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں:

عدل:

اجرتوں کے تعیین کے سلسلہ میں پہلا اصول "عدل" ہے۔عدل کا معنی یہ ہے کہ آجر اور اجیر دونوں میں کسی کے ساتھ بھی کسی قسم کی معاشی زیادتی نہ ہو۔ اجیر کو اپنی محنت کا صلہ اور معاوضہ پورا ملے اور آجر کو بھی اس کے معاوضے کے عوض میں مطلوبہ کام پورا ملے۔ لغت میں عدل "برابری" کو کہتے ہیں۔عدل کا اطلاق یہ ہو گا کہ اجرت اس سطح پر متعین کیا جائے کہ آجر اور اجیر دونوں زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں برابر ہو جائیں۔ آجر کی بنیادی ضروریات (کھانا، لباس، رہائش اور علاج معالجہ) پر آنے والے اخراجات کے موافق اجیر کی بھی اجرت مقرر کی جائے

یہ اصول دراصل نبی کریم ﷺ کے درج ذیل ارشاد گرامی سے معلوم ہوتاہے:"إن إخوانكم خولكم جعلهم الله تحت أيديكم فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه مما يلبس۔"[12] کہ یقیناً تمہارے خدّام تمہارے بھائی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے ماتحت بنایاہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے بھائی کو اپنے ماتحت بطور ملازم رکھتاہے وہ اسے وہ کھانا کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور وہ لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث تعیینِ اجرت کا پیمانہ مقرر کرتی ہے۔ ملازمین اور مزدوروں کی اجرت اتنی مقرر کی جائے کہ آجر اور مالک کے گھر کی بنیادی ضرورتوں (کھانا، لباس، رہائش اور علاج معالجہ) پر اٹھنے والے اخراجات کے موافق ان کی اجرت اور مزدوری ہو، تاکہ اس سے ملازمین کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ڈاکٹر نور محمد صاحب اس

حدیث مبارکہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:"اس حدیث کی رو سے یہ اصول مستبد ہوتا ہے کہ ہر آجر سرمایہ دار ہو یا صنعت کار، اجیر کی اجرت کھانے پینے اور لباس کے اس معیار پر مقرر کرے جو وہ اپنے گھر خود اور بیوی بچوں کو کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہے۔"[13]

اگرچہ ہر انسان کی محنت اس کی دماغی اور جسمانی صلاحیت کے اعتبار سے دوسرے انسان سے مختلف ہے، تاہم بنیادی ضروریات اوران کی اخراجات کو پورا کرنے کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں۔ تمام ملازمین اور مزدوروں کی بنیادی ضروریات کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ان کو برابر سطح کی بنیادی اجرت ملے گی، جس سے ان کے کھانے پینے، کپڑے، صحت اور رہائش وغیرہ کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اضافی صلاحیت کی محنت کے لئے اضافی معاوضہ مقرر ہوگا۔ چناں چہ جو شخص جس قدر اپنے کام میں مہارت رکھتا ہو اس قدر اس کو اس کی مہارت کا الگ سے معاوضہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے نظام عدل میں بھی یہی اصول کار فرما ہے۔ تمام انسان اپنے اعمال میں برابر ہیں مگر جو انسان عمل میں اخلاص کا مظاہرہ کرتا ہے، تو اللہ تعالی اس کو زیادہ اجر اور فضیلت عطا فرماتا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: "وَ يُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْـلٍ فَضْـلَهٗ"[14] اور وہ ہر فضل (صلاحیت) والے کو اس کا استحقاق فضل دیتا ہے

احسان:

اجرتوں کے تعیین کا دوسرا اصول " احسان " ہے۔ عدل سے عادلانہ اجرت کی تعیین تو ہو جاتی ہے، لیکن عدل آجر اور اجیر کے درمیان اُنس اور محبت کا سبب نہیں بنتا۔ اور یہ اس لئے کہ عدل کا مزاج خشک ہے۔ اس وجہ سے اسلام "عدل" کے بعد "احسان" کا حکم دیتا ہے۔ اسلام ایک طرف تو ادائے حق یعنی اجرت کی بات کرتا ہے جو عدل ہے، تو دوسری طرف حق سے زائد ادائیگی (اضافی الاؤنس بطور احسان) کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ آجر کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ اجرت کو متعین کرتے وقت ملازم کے حق میں نرم گوشہ اختیار کرے۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:" ان الله رفق یحب الرفق"[15] کہ یقیناً اللہ تعالی نرم ہے اور وہ نرمی کو پسند کرتا ہے۔

اجرت کے متعین کرنے میں اسلام آجر کو نرمی اختیار کرنے اور احسان کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ قرآن کریم کے سیاق میں ایک بندہ احسان کا اسی طرح پابند ہے جیسا کہ وہ عدل کا پابند ہے۔ چناں چہ اللہ تعالی احسان اور عدل دونوں کا ایک ہی جگہ ایک ساتھ حکم دیتا ہے، باری تعالیٰ کا فرمان ہے:" اِنَّ اللّٰه يأمرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَـانِ "[16] کہ بے شک اللہ تعالی عدل اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

قرآن حکیم کی صرف یہ آیت ایسی ہے جس میں عدل اور احسان دونوں کا حکم ایک ساتھ آیا ہے۔اس کے علاوہ کئی آیات میں اللہ تعالی نے عدل اور احسان کا حکم الگ الگ دیا ہے۔عدل اپنی جگہ پر اللہ تعالی کا فرضی اور تاکیدی حکم ہے مگر اس آیت میں عدل کی تاکید کے ساتھ ساتھ احسان کی تاکید کو بھی جوڑ دیا گیا ہے کہ جس طرح تمام انسان عدل کرنے کے پابند ہیں، بعینہٖ اسی طرح احسان کرنے کے بھی پابند ہیں۔

بعض اوقات عدل کرنے سے تمام بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوپاتیں، ایسی صورت حال میں احسان کے اصول سے ہی وہ ضروریات پوری ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا ملازم کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے احسان کے اصول کے تحت اس کو کچھ اضافی الاؤنس دئے جائے، جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوجائیں۔

سید ابوالا اعلی مودودی (م:1979ء) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: " ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہوجانا، یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کرکے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے"۔[17]

لہٰذا "احسان" ان بنیادی ضروریات کو جو عدل سے پوری نہیں ہوسکتیں پورا کرنے کے لیے ایک بہترین اصول ہے۔

محنت:

تعیین اجرت کے لئے تیسرا اصول "محنت کا حصہ" ہے۔ یعنی طے شدہ اجرت کے علاوہ مزدور کی محنت سے پیدا ہونے والے سرمایہ میں اس کو حصہ دینا۔ نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اسی پس منظر میں ارشاد فرمایا کہ:" أعطوا العامل من عمله "[18] کہ ملازم کو اس کی محنت سے کچھ دو۔

مناظر احسن گیلانیؒ (م:1956ء) اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:" اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ کیا علاوہ مزدوری کے "منافع" میں مزدور کا کچھ حصہ اسلام مقرر کرنا چاہتا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلام کی کتب فقہ میں ہمیں اب تک اس کے متعلق کوئی بات نہیں ملی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس کام سے جو خادم نے کیا ہے، خادم کو اس کے پیداواری ثمرات سے کچھ نہ کچھ حصہ علاوہ اجرت ملنا چاہئے "۔[19]

ڈاکٹر نور محمد صاحب لکھتے ہیں:

"مالک (سرمایہ دار) کے مال اور مزدور کی محنت سے کھانا تیار ہوا ہے۔ مالک سرمایہ دار مزدور کو محنت کے پیداواری کھانے یا دوسری پیداوار میں اسے شریک کرلے۔ اس حدیث میں دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ پیداواری فوائد میں شرکت اصل اجرت کے علاوہ ہو، کیوں کہ خادم کو کھانے کا ایک لقمہ یا دو لقمہ دے دینا اس کی محنت کا صلہ نہیں بن سکتا"۔[20]

لہٰذا درج بالا اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اجرت کی تعیین کرنی چاہئے، تاکہ ملازمین معاشی استحصال کا شکار نہ ہوں۔

تعیینِ اجرت کا شرعی معیار:

ملازمین کی اجرت کے تعیین کے متعلق فقہاء نے "کفایت" کو معیار قرار دیا ہے۔ کفایت کا معنی یہ ہے کہ ملازمین کی اتنی اجرت ہو کہ اس سے "ملازمین اور ان کے اہل وعیال کی ضروریات زندگی" پوری ہو سکیں۔

چناں چہ علامہ زیلعیؒ (م:743ھ) فرماتے ہیں:"حل رزق القاضي من بيت المال--- يعطى منه ما يكفيه وأهله على هذا كانت الصحابة والتابعون «وبعث رسول الله - صلى الله عليه وسلم - عتاب بن أسيد إلى مكة، وفرض له وبعث عليا، ومعاذا إلى اليمن، وفرض لهما»، وكان أبو بكر والخلفاء من بعده يأخذون كفايتهم فكان إجماعا"۔[21]

قاضی کا بیت المال سے روزی (تنخواہ) لینا حلال ہے۔۔۔ اسے اتنا مقدار دیا جائے گا جو اس کے لئے اور اس کے اہل وعیال کے لئے کافی ہو۔ اور اس پر صحابہ اور تابعین کا عمل رہا ہے۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ نے عتاب بن اسیدؓ کو مکہ بھیج دیا اور اس کے لئے تنخواہ مقرر کی اور حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا اور ان کے لئے تنخواہ مقرر کی، اور حضرت ابو بکرؓ اور ان کے بعد خلفاء اپنی ضرورت کے موافق لیتے تھے تو یہ اجماع ہوا۔

علامہ ماوردیؒ (م:450ھ) فرماتے ہیں: "ورزقه مقدر بالكفاية من غير سرف ولا تقتير.وكذلك أرزاق أعوانه من كاتب، وحاجب، ونائب..."۔[22] اور قاضی کی تنخواہ اس کی کفایت کے ساتھ مقدر ہے بغیر اسراف اور کمی کے، اور اسی طرح اس کے مددگاروں کی تنخواہ جو کاتب، دربان، نائب وغیرہ ہیں۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:"كما تجوز كفاية القاضي من بيت المال تجعل كفاية عياله ومن يمونه من أهله وأعوانه في مال بيت المال"۔[23]

جیسا کہ قاضی کی کفایت بیت المال سے درست ہے اسی طرح اس کے عیال اور جن کا بوجھ وہ اٹھاتا ہے اس کے اہل میں سے اور اس کے مددگاروں کے لئے بھی بیت المال سے کفایت مقرر کیا جائے گا۔

ابن نجیمؒ (م:970ھ) تحریر فرماتے ہیں:"فقيه فرغ نفسه لتعليم الناس الفقه أو القرآن... بأن صرف غالب أوقاته في العلم وليس مراد الرازي الاقتصار على العامل أو القاضي بل أشار بهما إلى كل من فرغ نفسه لعمل المسلمين فيدخل الجندي والمفتي فيستحقان الكفاية مع الغني".[24]

کہ وہ فقیہ جس نے اپنے آپ کو لوگوں کو فقہ اور قرآن سکھانے کے لئے فارغ کیا ہو۔۔۔ کہ اپنے اکثر اوقات علم میں صرف کرتا ہو، اور علی رازیؒ کا مراد صرف عامل اور قاضی پر اقتصار کرنا نہیں ہے، بل کہ ان دونوں کے ساتھ ہر اس شخص کو اشارہ کیا ہے جس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے کام کے لئے فارغ کیا ہو، پس اس میں سپاہی اور مفتی داخل ہوں گے اور وہ مال دار ہونے کے باوجود کفایت کے مستحق ہوں گے۔

درج بالا عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ ملازمین کی اجرت کا معیار "کفایت" ہے، یعنی اتنی تنخواہ ہونی چاہئے جو اس کے لئے اور اس کے اہل وعیال کی بنیادی ضروری اخراجات کے لئے کافی ہو جائے۔

کفایت سے کیا مراد ہے؟

کفایت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہوں، اور اس کو کسی سے سوال کرنے کی نوبت نہ آئے۔ چناں چہ جرجانیؒ (م:816ھ) نے حد کفایت کی درج ذیل تعریف ذکر کی ہے:" ما يكون بقدر الحاجة ولا يفضل منه شيء، ويكف عن السؤال".[25] کہ کفایت یہ ہے جو حاجت کے بقدر ہو اور اس سے زائد نہ ہو اور سوال کرنے سے روکے۔

نبی کریم ﷺ نے درج ذیل حدیث مبارکہ میں حد کفایت کو بیان فرمایا ہے:

"من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة، فإن لم يكن له خادم فليكتسب خادما، فإن لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا»، قال: قال أبو بكر: أخبرت أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: «من اتخذ غير ذلك فهو غال أو سارق»" [26]

کہ جو ہمارا عامل ہو اسے بیوی کر لینی چاہئے، اگر اس کا خادم نہ ہو تو خادم رکھنا چاہئے، اگر اس کا گھر نہ ہو تو گھر بنانا چاہئے، ابو بکر فرماتے ہیں کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو اس سے زیادہ لے گا وہ خائن یا چور ہو گا۔

امام خطابیؒ (م:388ھ) اس حدیث مبارکہ کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "أن للعامل السكنى والخدمة ".[27] کہ عامل کو رہنے اور خدمت لینے کا حق حاصل ہے۔ یعنی اگر اس کا گھر اور خادم نہ ہو تو اس کے لئے اجارہ پر ملازم رکھا جائے گا جو اس کی خدمت کرے، اور اس کی رہائش کے لئے کرایہ پر گھر لیا جائے گا۔

محمد شمس الحقؒ عظیم آبادی (م:1911ھ) تحریر فرماتے ہیں:

" يحل له أن يأخذ مما في تصرفه من مال بيت المال قدر مهر زوجة ونفقتها وكسوتها وكذلك ما لا بد منه من غير إسراف".[28]

عامل کے لئے حلال ہے کہ اس کے تصرف میں جو بیت المال کا مال ہے اس سے بیوی کے مہر اور اس کے نفقہ اور جامہ کے بقدر لے۔ اور اسی طرح وہ جو ضروری ہو بغیر اسراف کے۔

مولانا مجیب اللہ ندویؒ (م:2006ھ) فرماتے ہیں کہ اسلامی نظامِ اجرت میں مزدوروں کو اتنی اجرت بہر حال ملنی چاہئے جس کے ذریعے وہ محض اپنے جسم وجان کا رشتہ ہی نہ قائم کر سکیں، بل کہ اس کے ذریعے غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم کا انتظام بھی کر سکیں۔[29]

اُجرت مقرر کرنے میں کفایت کے تعیین کا معیار:

اب رہا یہ سوال کہ اجرت مقرر کرنے میں "کفایت" کے تعیین کا کیا معیار ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فقہائے کرام نے اجرت کو مقرر کرنے میں "کفایت" کے تعیین کا معیار "عرف اور رواج" کو بنایا ہے۔ چناں چہ کاسانیؒ (م:587ھ) تحریر فرماتے ہیں:" رزق الإنسان كفايته في العرف والعادة كرزق القاضي والمضارب".[30] کہ انسان کی روزی (تنخواہ) وہ ہے جو عرف اور عادت میں اس کے لئے کافی ہو جائے، جیسے قاضی اور مضارب کی روزی (تنخواہ)۔

زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ عرف ورواج میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے، اس لئے ہر زمانے میں اسی زمانے کے لوگوں کا جو عرف ہو گا وہی معتبر ہو گا اور اسی کے مطابق تنخواہ مقرر کی جائے گی۔ چناں چہ ابن عابدین شامیؒ (م:1252ھ) تحریر فرماتے ہیں:"يقدر بقدر كفايته في كل زمان، لأن المؤنة تختلف باختلاف الزمان".[31] کہ قاضی کی تنخواہ کو ہر زمانے میں اس کی کفایت کے موافق مقرر کیا جائے گا، کیوں کہ خرچہ زمانے کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتا رہتا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ہر زمانے میں متوسط طبقہ کی جو ضروریات زندگی ہوتی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر تنخواہ مقرر کرنی چاہئے، جیسا کہ حضرت عمرؓ (م:24ھ) نے قاضی شریحؒ (م:78ھ) کو قاضی کے عہدہ پر فائز کیا تو ان کا وظیفہ ماہانہ سو درہم (زکوٰۃ کا آدھا نصاب) مقرر کیا، جب کہ حضرت علیؓ (م:40ھ) نے اپنے دور حکومت میں ان کا وظیفہ پانچ سو دراہم کر دیا تھا۔ چناں چہ ابن ابی لیلیٰؒ (م:148ھ) سے روایت ہے:

" بلغني أن عليا رزق شريحا خمسمائة".[32] کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علیؓ نے قاضی شریحؒ کے لئے پانچ سو درہم وظیفہ مقرر کیا تھا۔

علامہ ابن الہمامؒ (م:861ھ) تحریر فرماتے ہیں:" وكان عمر - رضي الله عنه - يرزق شريحا كل شهر مائة درهم ورزقه علي خمسمائة وذلك لقلة عياله في زمن عمر - رضي الله عنه -، أو رخص السعر وكثرة عياله في زمن علي - رضي الله عنه - أو غلاء السعر "۔[33] حضرت عمرؓ شریح کو ہر ماہ سو درہم وظیفہ دیتے تھے اور حضرت علیؓ نے ان کے لئے پانچ سو درہم وظیفہ مقرر کیا۔ اور یہ اس لئے کہ ان کے اہل وعیال حضرت عمرؓ کے زمانے میں کم تھے یا ارزانی تھی اور حضرت علیؓ کے زمانے ان کے اہل وعیال زیادہ تھے یا گرانی تھی۔

اس سے ایک تو یہ ثابت ہوا کہ تنخواہ عام عرف اور رواج کو سامنے رکھ کر مقرر کرنی چاہئے۔ اور دوسرا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدرس اور ملازم کے اہل وعیال زیادہ ہو جانے کے باعث نیز اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کے باعث ان کی تنخواہ میں اضافہ کرنی چاہئے۔ تاکہ وہ اپنی ضروریات زندگی کو احسن طریقے سے پوری کر سکیں۔

جامعہ دارالعلوم کراچی کے فتویٰ میں مذکور ہے کہ شریعت نے اس وظیفے کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں کی، بلکہ اس کے لئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ ان کو وقف کی آمدنی سے اتنا وظیفہ دیا جائے جس سے اس زمانے اور علاقے کے عرف کے مطابق ان کی حاجتیں پوری ہو جائیں، اور اس وظیفہ کے ملنے کے بعد وہ یکسوئی سے اپنی دینی خدمات انجام دے سکیں۔ انہیں مزید کمانے کی ضرورت نہ رہے کہ جس سے دینی خدمات کی انجام دہی میں خلل واقع ہو۔ حاجت سے مراد انسان کی اپنی اور اس کے اہل وعیال کے کھانے پینے، لباس اور رہائش وغیرہ کی ضروریات ہیں۔ اور مناسب مشاہرے سے مراد ایسا مشاہرہ ہے جس سے ائمہ حضرات اپنے معاشرے کے کم از کم درمیانی درجہ کے افراد کی طرح یہ ضروریات پوری کر سکیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ آج کل ائمہ حضرات کو جو انتہائی کم تنخواہ دینے کا رواج ہے اور اسی کو دین داری سمجھا جاتا ہے، یہ رواج نہ صرف یہ کہ شرعاً پسندیدہ نہیں، بل کہ فقہاء کرام کے بیان کردہ اصولوں اور اسلام کے ابتدائی تعامل کے بھی خلاف ہے اس لئے اس رواج کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔[34]

مفتی سید عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ متولی اور مدرسہ کے مہتمم کو لازم ہے کہ خادمان مساجد اور مدارس کو ان کی حاجت کے مطابق اور ان کی علمی قابلیت کے مطابق اور تقویٰ اور صلاح کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ ومشاہرہ (تنخواہ) دیتے رہیں۔ باوجود گنجائش کے کم دینا بری بات ہے اور متولی ومہتمم اللہ کے ہاں جواب دہ ہوں گے۔[35]

مزید فرماتے ہیں کہ اگر امام مسجد صاحبِ عیال ہے تو مسجد کے متولی پر لازم ہے کہ ان کی تنخواہ میں گرانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اضافہ کرے۔ مسجد کی آمدنی ہونے کے باوجود امام صاحب کے گھریلو اخراجات کے مطابق تنخواہ نہ دینا ظلم ہے۔[36]

خلاصہ یہ کہ ملازمین کی تقرری کے دوران عرف اور رواج کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لئے اتنی تنخواہ مقرر کرنی چاہئے جس سے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی بنیادی ضروریات کو پوری کر سکیں۔

خلاصۃ البحث:

تعیین اجرت کا شرعی معیار "کفایت" ہے۔ فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق کفایت سے مراد اتنی اجرت مقرر کرنا ہے جو اس زمانے کے متوسط درجہ کے افراد کی طرح ملازم اور اس کے اہل وعیال کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو جائے۔ ضروریات زندگی سے مراد غذا، لباس، مکان، علاج ومعالجہ اور تعلیم ہے۔ اجرت کی مقدار کے سلسلے میں معیار "عرف اور رواج" ہے۔ عرف کے بدل جانے کی وجہ سے اجرت میں اضافہ ہونے کے باعث یا ملازم کے اہل وعیال زیادہ ہو جانے کے باعث ملازم کی اجرت میں اضافہ کیا جائے گا۔

حوالہ جات

[1] ابن منظور، محمد بن مكرم، لسان العرب(بيروت:دار صادر)ج4 ص10۔

[2] سورة الاحزاب: 50

[3] الطبري، محمد بن جرير، جامع البيان في تأويل القرآن(بيروت:مؤسسة الرسالة،الطبعة: الأولى، 1420ھ)ج 20ص27۔

[4] سورة العنكبوت:27

[5] مجموعة من المؤلفين،المعجم الوسيط(بيروت:دارالدعوة)ج 1ص7۔

[6] الحصكفي، علاء الدين محمد بن علي،الدر المختار(بيروت: دار الكتب العلميةالطبعة: الأولى، 1423ھ)ص569۔

[7] أبو البقاء، أيوب بن موسى، الكليات(بيروت: مؤسسة الرسالة)ص48۔

[8] الكاساني،علاء الدين، أبو بكر بن مسعود،بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع(بيروت: دار الكتب العلميةالطبعة: الثانية، 1406ھ)ج 4ص193-194۔

[9] الكاساني،بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،ج 4ص193۔

[10] البيهقي، أبو بكر أحمد بن الحسين، السنن الكبرى(حيدر آباد: مجلس دائرة المعارف النظامية، الطبعة : الأولى .1344ھ)ج6ص120۔

[11] نفس مصدر۔

[12]البخاري، محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري(بيروت: دار ابن كثير، الطبعة الثالثة، 1987ء)ج2ص899۔

[13] غفاری، ڈاکٹر نور محمد، اسلام کا معاشی نظام(لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، 1994)ص236۔

[14] سورة هود:3۔

[15]القشيري، مسلم بن الحجاج، صحيح المسلم(بيروت: دار إحياء التراث العربي)ج 4ص2003۔

[16]سورة النحل: 90

[17]مودودی، سید ابوالاعلی، تفہیم القرآن(لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، 2004ء)ج2ص565۔

[18] الشيباني، أحمد بن محمد، مسند الإمام أحمد بن حنبل(بيروت: مؤسسة الرسالةالطبعة: الأولى، 1421ھ)ج 14ص259۔

[19] گیلانی، مولانا مناظر احسن، اسلامی معاشیات(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2007ء)ص393۔

[20] غفاری، اسلام کا معاشی نظام، ص236۔

[21] الزيلعي، عثمان بن علي، تبيين الحقائق(القاهرة :المطبعة الكبرى الأميرية - بولاق، الطبعة: الأولى، 1313 ھ)ج 6ص33۔

[22] الماوردي، أبو الحسن علي بن محمد، الحاوي الكبير(بيروت :دار الكتب العلمية،الطبعة: الأولى، 1419ھ)ج 16ص293۔

[23]نظام ، الشيخ نظام وجماعة من علماء الهند،الفتاوى الهندية(بيروت:دارالفكر الطبعة: الثانية، 1310 ھ)ج 3ص 329 ۔

[24]ابن نجيم، زين الدين بن إبراهيم، البحر الرائق(بيروت: دار الكتاب الإسلامي)ج5 ص127، ابن عابدين ، محمد أمين بن عمر، رد المحتار(بيروت:دار الفكر، 1992ء)ج4 ص217۔

[25]الجرجاني، علي بن محمد،كتاب التعريفات(بيروت:دار الكتب العلمية ،الطبعة: الأولى 1403ھ) ص185۔

[26] السِّجِسْتاني، أبو داود سليمان بن الأشعث، سنن أبي داود(بيروت: المكتبة العصرية)ج3ص134۔

[27] الخطابي، أبو سليمان حمد بن محمد، معالم السنن(حلب : المطبعة العلمية،الطبعة: الأولى 1351ھ)ج 3ص7۔

[28] عظيم آبادي، محمد شمس الحق، عون المعبود(بيروت:دار الكتب العلمية،الطبعة الثانية،1415)ج8 ص115۔

[29] ندوی، مولانا مجیب اللہ، اسلامی قانون محنت واجرت(لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری)ص190۔

[30] الكاساني،بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،ج 4ص23۔

[31] ابن عابدين ، رد المحتار ،ج6 ص389۔

[32] ابن أبي شيبة، أبو بكر عبد الله بن محمد، المصنف في الأحاديث والآثار(الرياض:مكتبة الرشد ،الطبعة الأولى ، 1409ھ)ج4 ص430۔

[33] ابن الهمام، محمد بن عبد الواحد السيواسي ،فتح القدير(بيروت: دار الفكر)ج 7ص258۔

[34] ہاشم، محمد طلحہ، جامعہ دارالعلوم کراچی، فتوی نمبر:2109/14۔

[35] لاج پوری، مفتی سید عبدالرحیم، فتاوی رحیمیہ (کراچی: دارالاشاعت،2009ء)ج4ص138۔

[36] لاج پوری، فتاوی رحیمیہ، ج9ص153۔